تیرھویں صدی کے ھندوستان میں بعض عربی کتابوں کے فارسی تراجم

(فارسی ادب کے ارتقاء میں ان کی علمی و تاریخی اہمیت کا جائزہ)

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

بارھویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں سلطان معزالدین بن سام اور اس کے امراء کی شمالی ھندوستان میں فتوحات کے نتیجہ میں جو سیاسی، ثقافتی اور علمی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ دہلی سلطنت کی بنیاد پڑی جو جلد ہی وسط ایشیا، خراسان، فارس اور بغداد میں منگول حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کے نتیجہ میں فارسی بولنے والے ممالک کے علماء و فضلاء کی آماجگاہ بن گئی۔ کیونکہ اس دور میں مصر مغرب میں اور ہندوستان مشرق میں مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بن گئے تھے لیکن تیرہویں صدی عیسوی میں مہاجرین کے جم غفیر کے آنے سے پہلے بھی مسلمان تاجروں، سپاہیوں اور فوجی افسروں کی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود تھی البتہ ان میں مستند علماء کی اور عربی زبان میں دینی کتابوں سے براہ راست ستفادہ کرنے والوں کی خاصی کمی تھی، لہذا علم دوست سلاطین اور اُن کے امراء نے مسلمانوں کی تعلیم اور دینی رہنمائی کے لیے اہم عربی کتابوں کے فارسی ترجموں کی ضرورت محسوس کی۔ اس کی طرف علماء و فضلاء کو متوجہ کیا، اس کی ترغیب دی، اُن کی ہمت افزائی اور مالی اعانت کی چنانچہ بہت سے علماء اور دانشوروں نے عربی کی معیاری کتابوں کا جو کہ مذہب، حکمت اور تاریخ سے متعلق تھیں فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے پہلے فارسی میں علم اور مذہب پر نثری لٹریچر کی بڑی کمی تھی۔

سلطنت کے ابتدائی عہد میں جن عربی کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے ان میں نثر کے مختلف اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ نتیجہ میں فارسی زبان کو وسعت ملی اور وہ عربی کی طرح علمی

اور فلسفیانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بن سکی۔ فارسی ایک علمی اور ادبی زبان کی حیثیت سے عربی زبان کے مقابل ایک دوسری اسلامی زبان کی حیثیت سے اُبھرنے لگی

یہاں یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اعلیٰ معیار کے علمی کارناموں کے عربی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کا آغاز ایک تحریک کی شکل میں سلطنت دہلی ہی میں ہوا۔ ایران اور وسط ایشیا کے ممالک میں اس طرح کا کام بعد میں شروع ہوا۔ لہٰذا ان ترجموں کی فارسی ادب اور زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ ان ترجموں کے حوالے کے بغیر یہ تاریخ نامکمل رہے گی۔ اسی طرح برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی رجحانات اور مسلم ثقافت پر بھی ان کا بڑا اثر پڑا ہے۔ علاوہ ازیں ان ترجموں کے ذریعہ مسلم حکمراں طبقہ کی سیاسی، مذہبی اور ثقافتی رہنمائی بھی ممکن ہوسکی۔ ان کتابوں کے مترجمین نے جو مقدمے لکھے وہ بڑی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سلاطین اور امراء کے کارناموں کے ذکر کے علاوہ اس عہد کے ثقافتی اور سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح یہ مقدمے اس کمی کو بڑی حد تک پوری کرتے ہیں جو معاصر تاریخی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ عہد وسطیٰ کے مورخین اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق تاریخ میں سلاطین کی فتوحات، جنگیں، نظم ونسق سے متعلق اصلاحات یا پھر اُن کی داد و دہش کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ ان واقعات کا اکثر ذکر نہیں ہوتا جو کہ ثقافت، تہذیب اور ذہن وفکر میں تبدیلی پیدا کرنے کے باعث ہوئے تھے۔ اس مقالہ کا آغاز ہم سندھ کی عربی تاریخ کے فارسی ترجمہ سے کریں گے۔

سب سے پہلی عربی تصنیف جس کا ہندوستان میں فارسی زبان میں ترجمہ ہوا وہ چچ نامہ ہے۔ یہ راجہ داہر کے خاندان اور سندھ پر عرب حملہ اور فتح سے متعلق تھی۔ اس کتاب کے مترجم اچہ شہر کے رہنے والے علی بن حامد بن ابوبکر کوفی عرب نژاد عالم تھے۔ انھوں نے اس ترجمہ کو ۱۲۱۶ء میں مکمل کرکے سندھ اور پنجاب کے فرماں روا، سلطان ناصر الدین قباچہ اور اس کے علم دوست وزیر عین الملک الاشعری کے نام معنون کیا۔ اگرچہ اصل عربی نسخہ جس سے ترجمہ کیا گیا تھا دستیاب نہیں ہوسکا تاہم اس کے فارسی ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سندھ کی فتح کے کچھ بعد لکھا گیا تھا اور اس میں سندھ پر عربوں کی فتح جو کہ محمد بن قاسم کی سپہ سالاری میں انجام پائی تھی کے علاوہ عربوں سے ماقبل سندھ کی تاریخ جو کہ سینہ بہ سینہ آرہی تھی اور جس کو عربوں نے برہمنوں سے سنا ہوگا اُن کو بھی شامل کرلیا تھا۔ عربوں کی فتح

سے متعلق واقعات قدیم عرب ماخذوں میں بھی تقریباً اسی طرح موجود ہیں لہذا چچ نامہ کی تاریخی اہمیت مسلم ہوجاتی ہے[1] البتہ کچھ واقعات کے متعلق تفاصیل زیادہ ملتی ہیں۔

ترجمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی سندھ میں، خاص طور پر ساحلی علاقہ پر بدھ مذہب کے پیرؤں کی اچھی خاصی آبادی اس وقت بھی موجود تھی۔ ہیون سانگ جو کہ ہندوستان میں عربوں کی فتح سے تقریباً ایک صدی پہلے آیا تھا اس کے مطابق ہندو حکمران بدھ مذہب والوں کے ساتھ خراب رویہ اختیار کیے ہوئے تھے اور ان کا معاشی استحصال ہو رہا تھا۔ غالباً یہی اسباب تھے کہ بدھ مذہب کے ماننے والوں نے پہلے تو عرب فاتحین کا ساتھ دیا اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اسلام قبول کرلیا۔ ان نئے ہندی نژاد مسلمانوں کے ذریعہ عرب فاتحین کو مقامی تعاون (Local support) ملا اور ان کا سیاسی اقتدار مستحکم ہوا۔

جہاں تک ترجمہ میں اسلوب کا معاملہ ہے، وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ عربی کی تاریخوں کے برعکس مترجم نے قدیم فارسی روایات کو اپنایا ہے۔ مثلاً تاریخی واقعات کے ساتھ رومانی اور افسانوی عناصر کو شامل کردیا ہے، اس آمیزش سے عہد وسطیٰ کے قارئین کے لیے کتاب یقیناً دلچسپ بن گئی ہوگی لیکن آج تاریخ کے طالب علم کی نظر میں اس کی اہمیت کم ہوجاتی ہے[2] لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کتاب تاریخی اہمیت کی تفصیلات سے خالی ہے۔ مترجم نے عربی نسخہ سے تاریخی تفاصیل غالباً مکمل طور پر فارسی میں منتقل کردی ہیں اگر یہ ترجمہ نہ ہوتا تو عربوں کے طرز حکومت کے متعلق بہت سی تاریخی معلومات اصل عربی نسخہ کے ساتھ دست برد زمانہ کی نذر ہوجاتی اور ہم ان سے محروم ہوجاتے۔ مثال کے طور پر چچ نامہ سے اس عام خیال کی تردید ہوتی ہے کہ سندھ اور پنجاب میں عربوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندو معاشرے میں سماجی امتیازات کو جو کہ ذات پات کے تصور

---

[1] ملاحظہ کیجیے علی بن حمید بن ابوبکر کوفی، فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ، مرتبہ نبی بخش بلوچ، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء

[2] مثال کے طور پر راجہ داہر کی بیٹیوں کی داستان کہ دمشق جاکر انھوں نے خلیفہ کو بتایا کہ محمد بن قاسم نے ان کی عصمت دری کی اور یہ سن کر خلیفہ برہم ہوگیا اور اس نے غصہ میں محمد بن قاسم کو ختم کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ سب افسانہ ہے۔ اس کی تاریخی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ محمد بن قاسم کی سندھ سے واپسی سیاسی وجوہات کی بنا پر واقع ہوئی تھی۔

سے پیدا ہوئے تھے دھکا لگا تھا۔ درحقیقت عرب حکمرانوں نے ہندوؤں کی سماجی اور مذہبی روایات میں بالکل دخل نہیں دیا۔ بلکہ ہندوؤں کو ان کے رسوم ورواج اور مذہبی قوانین کو بدستور باقی رکھا۔ مثال کے طور پر محمد بن قاسم کو فتح کے بعد اس کے ہندو مشیروں نے بتایا کہ جاٹ نیچی ذات ہی کے نہیں ہیں بلکہ اخلاقی طور پر بھی گرے ہوئے ہیں کیوں کہ وہ جرائم پیشہ ہیں۔ داہر کے زمانہ میں ان پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ گھوڑے پر زین کس کر سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ سفر کے وقت جوتا نہیں پہن سکتے تھے۔ اگر کسی شہر یا قصبہ میں داخل ہوتے تھے تو کتا ہمراہ رکھتے تھے اور موٹے اور سستے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے تھے تاکہ ان کی آمد پر اُن کی شناخت میں دقت نہ ہو سکے[۱]۔ اگرچہ محمد بن قاسم نے اپنے مشیروں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ان امتیازات کو ختم نہیں کیا لیکن تاریخی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے ادوار میں اسلامی اثرات کے تحت جاٹوں کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی اور وہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اس قدر طاقت ور ہو گئے کہ سندھ میں انھوں نے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

علاوہ ازیں ترجمہ کے مقدمہ سے مترجم کے اپنے عہد کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے ذریعہ حسن نظامی کی تالیف "تاج المآثر" اور منہاج سراج الجرجانی کی تالیف "طبقات ناصری" میں موجود تاریخی مواد میں کسی حد تک اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سلطان ناصر الدین قباچہ اور اس کے وزیر عین الملک العشری کے اوصاف کا ذکر ہے کہ دونوں کی علم دوستی اور فیاضی سے متاثر ہو کر وسط ایشیاء اور خراسان سے بہت سے علماء، فضلاء اوچہ اور ملتان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے یہ دونوں شہر علم ودانش کے مرکز کی حیثیت سے ابھرے۔ بہت سے فضلاء نے سلطان اور وزیر کے احسانات کے صلہ میں کتابیں تصنیف کیں اور ان کے نام معنون کیا۔ خود مترجم کے مطابق جب وہ کسی غلطی کی بنا پر سرکاری ملازمت سے برطرف ہو گیا اور بے روزگاری کا شکار ہوا تو اس نے سوچا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ کس طرح بحال کیا جائے۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس سلسلے میں تالیف اور تصنیف ہی معاون ہو سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس کو قصبہ بھکر

---

[۱] چچ نامہ۔ ص ص ۹۰ تا ۹۲

(قدیم منصورہ) میں ایک مقامی عرب نژاد عالم، قاضی اسماعیل بن علی الثقافی (جوکہ محمد بن قاسم کی اولاد میں سے تھے) کے ذاتی کتب خانہ میں سندھ پر عربوں کی فتح اور وہاں کے قدیم ہندو حکمرانوں کی تاریخ میں عربی میں کتاب ملی۔ یہ کتاب حجازی لہجے میں لکھی ہوئی تھی۔ اس کی افادیت کے پیش نظر علی الکوفی نے اس کو فارسی میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ ترجمہ مکمل کرنے پر وزیر کے نام معنون کیا۔ مقدمہ میں وزیر کا پورا نام حسین بن ابی بکر بن محمد العشری الملقب عین الملک العشری دیا ہے[1]

علاوہ ازیں مترجم نے بھکر اور اوچہ کی تعریف میں مزید بتایا ہے کہ دونوں مقامات علم وتمدن کے مراکز تھے۔ بھکر میں قدیم عرب خاندان موجود تھے جن کے بہت سے افراد کا علماء وفضلا میں شمار ہوتا تھا۔ یقیناً انھوں نے اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھا تھا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ چچنامہ واحد ماخذ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدین قباچہ نے سلطان بننے کے بعد اپنا پایہ تخت اوچہ کو بنایا تھا نہ کہ ملتان جیسا کہ غلط طور پر مشہور ہے الکوفی اوچہ کو احتراماً حضرت اوچہ لکھتا ہے جیسا کہ وسط ایشیا میں دستور تھا[2] ترجمہ کے متن میں بہت سے ہندی الفاظ اور اصطلاحات بھی ہیں۔ جیسے کہ ٹھکر بمعنی ٹھاکر آتا ہے۔ دیودار، مٹی، جوگنی (بمعنی جوگن) رائے (ہندو راجہ) اور رانگان وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان سے اس امر کی نشاندھی ہوتی ہے کہ ابتدا ہی سے مسلمانوں نے مقامی زبان کے الفاظ اور اصطلاحات کو آسانی کے لیے اپنانا شروع کر دیا تھا اور اس طرح ملی جلی بولیوں کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ ان بولیوں میں دہلی کی ہندوی نے بعد میں اردو کی ترقی یافتہ شکل اختیار کی۔

کتاب ہذا کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مترجم نے عربی عبارت کو فارسی زبان میں منتقل ہی نہیں کیا بلکہ جگہ جگہ عرب اور ان کے بعد کے مسلم حکمرانوں کے ہندؤں سے اچھے سلوک اور حکمت عملی کو نمایاں کیا ہے تاکہ نووارد ترک سلطان اور اس کے نووارد

---

[1] چچ نامہ۔ صد ۶،۵

[2] عہد وسطیٰ میں مغلوں سے قبل سلطان کا دارالخلافہ حضرت کہلاتا تھا۔ بارھویں صدی کی تصانیف جو کہ غزنی میں لکھی گئی تھیں ان میں دارالخلافہ کو حضرت غزنی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح سلطان التمش کے ابتدائی عہد کی کتابوں میں دہلی کو حضرت دہلی لکھا گیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب وہاں کوئی صوفی بزرگ دفن نہیں کیے گئے، اس کا اگلے صفحوں میں بیان ہوگا۔

امرا یہاں کی روایات سے واقف ہو کر اُن پر عمل پیرا ہو سکیں اور بے احتیاطی میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ ہر جگہ ہندو زمین دار بڑے طاقت ور تھے۔ بڑے علاقوں پر حکمراں بھی تھے اور فوجوں کے مالک بھی، لہٰذا ہندوستان کی سیاست میں وہ ایک زبردست عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ مقامی تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان سے اچھے روابط رکھے جائیں۔ غالبًا اسی غرض سے الکوفی نے عربوں کے رائے اور رانگان سے اچھے تعلقات کا ذکر کیا ہے، بعد کی تاریخوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ قباچہ کے بعد سلطان التمش اور اس کے پیروؤں نے بھی دہلی کی وسیع سلطنت کے زمانہ میں زمین داروں سے دوستانہ تعلقات کی حکمت علی اپنائی اور ہندوؤں کے مذہب اور اُن کی مذہبی روایات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔

چچ نامہ کے بعد دوسری اہم کتاب جس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ بھی قباچہ کے دربار سے منسلک عالم نے کیا وہ قاضی التنوخی کی مستند اور مقبول تالیف "کتاب الفرج بعد الشدۃ" تھی۔ اس کے مترجم وسط ایشیا سے آئے ہوئے مہاجر، سدید الدین محمد عوفی تھے۔ اس ترجمہ کے ذریعہ مترجم کا مقصد دنیائے عرب کے مسلمانوں کی تاریخ سیاسی اور دینی اور دنیاوی علوم سے فارسی داں لوگوں کو واقفیت بہم پہنچانی تھی۔ عوفی نے اس ترجمہ کو سلطان ناصر الدین قباچہ کے نام معنون کیا اور آخر الذکر کو اس کی افادیت کا اس قدر احساس ہوا کہ اُس نے فاضل مترجم سے خواہش ظاہر کی کہ کتاب الفرج بعد الشدۃ کی طرز پر ہی فارسی میں کتاب لکھی جائے جس میں بعد کے زمانہ سے، سلطان کے اپنے زمانہ تک کے حالات آجائیں۔ سلطان کی فرمائش پر عوفی نے "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" کو لکھنا شروع کیا۔ یہ کام جاری ہی تھا کہ ۱۲۲۷ء میں سلطان التمش نے قباچہ کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ کئی ماہ کی جنگ کے بعد ۱۲۲۸ء میں قباچہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد عوفی دہلی آکر التمش کے وزیر نظام الملک جنیدی سے وابستہ ہو گیا اور اُس کی سرپرستی میں اپنی تالیف جوامع الحکایات ولوامع الروایات کو مکمل کیا جو کہ اپنے مضامین کے تنوع کے اعتبار سے انسائیکلوپیڈیا کی نیچر کی کتاب کہی جاسکتی ہے۔

دہلی کا سلطان شمس الدین التمش (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) اور اُس کا وزیر نظام الملک جنیدی بھی علم دوست تھے۔ خاص طور پر وزیر جنیدی عالم نواز ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی عالم آدمی تھا۔ اس کے زمانہ کی جو کتابیں آج دستیاب ہوتی ہیں وہ زیادہ تر اسی کی سرپرستی

میں لکھی گئی تھیں۔ اس کی سرپرستی میں جو کام پایۂ تکمیل کو پہنچے اور محفوظ رہ گئے ہیں اُن میں ہم تبصرہ کے لیے پہلے ابوبکر بن عثمان الکاسانی کے فارسی ترجمہ کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ یہ دہلی میں لکھا ہوا پہلا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ الکاسانی نے البیرونی کی مشہور کتاب 'الصیدلہ' کا ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کے ذریعہ الکاسانی کا مقصد بھی فارسی داں امراء اور اُن کے بچوں کو علم طب سے واقفیت بہم پہنچانے کے علاوہ اپنے لیے نئے دارالخلافہ دہلی میں فضلاء کے حلقہ میں جگہ پیدا کرنا تھا۔ کتاب کے متن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اس کا مقدمہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

الکاسانی نے اپنے مقدمہ میں دہلی کے سلطان التمش کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق سلطان کو 'ظلّ اللہ فی الارض' کہتا ہے اور دہلی کو جو کہ ابھی ایک معمولی قصبہ سے شہر کی صورت اختیار کر رہا تھا حضرت دہلی لکھتا ہے[1]۔ الکاسانی یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب وہ دہلی آئے تو انھوں نے اس کو ایک دولت سے بھرا ہوا شہر ہی نہیں پایا بلکہ وہاں پر اُس نے علماء و فضلا کی کثیر تعداد بھی پائی جو کہ سلطان التمش کی شاہانہ عنایت کی اطلاع پاکر وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہ وسط ایشیا کے دور دراز علاقوں سے وہاں پر چنگیز خاں کے حملہ سے بچ کر پناہ کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے۔ الکاسانی اس ضمن میں خاص طور پر اشراف کا ذکر کرتا ہے اور اپنے مربی سلطان التمش کے متعلق مزید لکھتا ہے کہ سلطان کی خوش نصیبی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اُس کے آقا سلطان قطب الدین ایبک نے پہلی ہی نظر میں اس کی بے پناہ ذہانت، متانت اور اُس کا جذبہ وفاداری، تحمل مزاجی اور شجاعت کا اندازہ کر کے اپنی شاہانہ عنایت سے نوازا جس کی وجہ سے مجلس عالی[2] (یعنی التمش) جلد ہی ترقی کر کے اعلیٰ

---

[1] اس وقت تک دہلی میں کسی صوفی بزرگ کا وصال نہیں ہوا تھا لہٰذا یہ مقرر کرنا غلط ہے کہ دہلی بزرگوں کی قبروں کی وجہ سے حضرت دہلی کہلاتی تھی۔ حضرت کا لفظ دارالخلافہ کے لیے احتراماً استعمال ہوتا تھا جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

[2] مغلوں کے عہد سے قبل سلاطین دہلی کے زمانہ میں وزیر سلطنت کے نام اور دوسرے خطابات سے پہلے مجلس عالی لکھا جاتا تھا اور اسی طرح دوسرے بڑے امراء کے لیے مسند عالی لکھا جاتا تھا 'کتاب الصیدلہ' پہلا ماخذ ہے جس میں یہ خطاب التمش کے لیے اُس کے سلطان بننے سے پہلے کے دور کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

عہدے پر سرفراز ہوئے۔ ان احسانات کے بدلہ میں مجلس عالی نے بڑی مستعدی سے اپنے آقا کی خدمت کی اور مشکل مہمات کو سر کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی خوش نصیبی کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جس نے بھی ان کے خلاف کینہ یا دشمنی کا جذبہ رکھا اور مخالفت کی ناکامی اور محرومی اس کا مقدر بن گئی اور ان میں سے ہر ایک کو تباہی کا شکار ہونا پڑا[1]۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ دہلی میں اُس کے قیام پذیر ہونے کے بعد اُس نے ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں بہت سے لوگوں کو سلطان کے خلاف علم بغاوت برپا کرتے ہوئے پایا لیکن ایک ایک کرکے وہ صفحہ ہستی سے غائب ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں بادشاہ کا رعب اور اُس کی عظمت رعیت، ترک اور تاجیک (امرار)، آزاد اور غلام ہر ایک کے دل میں بیٹھ گئی اور سب مطیع اور فرماں بردار ہو گئے۔ لہذا امن و امان قائم ہو گیا، لوگ بدنظمی اور سیاسی انتشار سے نجات پا گئے اور سلطان کے عدل سے ملک مستفیض ہو کر خوش حال ہونے لگا۔ مذکورہ بالا لوگوں کی طرح جلد ہی ہندو راجگان اور سردار اپنے اپنے علاقوں میں فرماں بردار بن گئے اور سلطان سے تعاون کرنے لگے۔ اُن کے تعاون سے بھی سلطنت کی شان دوبالا ہوئی۔

مقدمہ کے آخر میں الکاسانی نے التمش کے بڑے شاہزادے ناصر الدین محمود (ولی عہد) کی تعریف کی ہے کہ وہ علم دوست ہے اور تمام عمدہ صفات کا حامل ہے۔ اس کے دامن فیض سے علما، وفضلا وابستہ ہیں۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ وہ عرصہ دراز تک سوچتا رہا کہ دربار شاہی میں کوئی بیش بہا تحفہ خدمتی[2] (یعنی پیشکش) کے طور پر سلطان کو پیش کرکے دربار شاہی سے تعلق پیدا کرے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ ایسا تحفہ کتاب ہی ہو سکتی ہے جس کا مقدمہ سلطان

---

[1] کتاب الصیدلہ، ص ۱۵۰۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابتدائی زمانہ میں التمش نے اپنے مخالفین کو مختلف طریقوں سے قتل کرا دیا تھا۔ اس سلسلے میں منہاج سراج نے امراء کے طبقہ میں کنایتاً اشارہ کیا ہے اور برنی نے فیروز شاہ کے احوال میں اس بات کو صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔

[2] مغلوں سے پہلے سلطنت دہلی کے زمانہ میں پیش کش کی بجائے خدمتی کی اصطلاح کا استعمال ہوتا تھا۔ مغلوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد خدمتی کی بجائے پیش کش کی اصطلاح کا استعمال شروع ہوا۔

کے اوصاف سے متعلق ہو۔ کیونکہ دربارشاہی کے قابل سب سے اچھا تحفہ سلطان وقت کے عمدہ کارناموں کا ذکر ہی ہوسکتا تھا تاکہ اس کے عہد کی تاریخ سے آنے والی نسلیں بہرہ ور ہوسکیں"۔ بڑے غور وفکر کے بعد البیرونی کی کتاب الصیدلہ کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنا شروع کیا تاکہ عربی سے ناواقف لوگ اس کا فارسی میں مطالعہ کرکے علم طب سے واقفیت حاصل کرسکیں۔[1]

اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف اصل عبارت کا ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں مترجم نے جہاں بھی موقع پایا ہے وہاں معدنیات دستیاب ہونے کے علاقوں اور اُن کی خاصیات پر مزید معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ اصل کتاب میں یہ اس کی طرف سے اہم اضافہ ہے۔ اس سے اس کی علم طب میں دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ علاوہ ازیں جہاں بھی ممکن ہوسکا ہے اُس نے بہت سی ادویات اور جڑی بوٹیوں اور پھلوں کے ہندوی نام بھی دیے ہیں۔ چچ نامہ کی طرح یہ کتاب بھی مسلمانوں کی ہندوستان کی عام بولی سے دلچسپی پر روشنی ڈالتی ہے۔ کشمیری سیب کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی ہندو ریاست اور سلطنت دہلی کے مابین تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔[2]

امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کا فارسی ترجمہ بھی تقریباً اسی زمانہ میں دہلی میں ہوا۔ یہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مترجم بھی بہت بڑے مہاجر عالم تھے۔ یہ ترک وطن کرکے پہلے لاہور میں ٹھہرے۔ وہاں کے سیاسی حالات سے اور لوگوں کی مخالفت سے مجبور ہوکر مستقل طور پر دہلی منتقل ہوگئے۔ ان کا نام مجدالدین ابوالمعالی مویدبن محمد جرجاجی تھا۔ انہوں نے بھی اپنے ترجمہ کو ایک مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جس میں ہمیں سلطنت دہلی کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے علمی اور دینی احوال اور مسائل کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مترجم فرماتے ہیں کہ امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین کی علمی اور دینی اہمیت کے پیش نظر وزیر سلطنت نظام الملک جنیدی نے اُن کو ترغیب دی کہ وہ اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کریں تاکہ مسلم مہاجرین جو کہ عربی سے نابلد ہیں وہ علم دین سے واقف ہوسکیں اور اس کا نووارد مسلمانوں میں فروغ ہوسکے۔ مترجم نے اپنے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ دہلی منتقل ہونے سے قبل لاہور

---

[1] کتاب الصیدلہ ترجمہ صد ۱۶-۱۷ [2] ایضاً صد ۹۲ تا ۱۸۰

میں درس وتدریس کے کام میں مشغول تھے۔ اُن کی علمی شہرت سے لوگ متاثر ہو کر اُن کی تذکیر میں بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے۔ طلبار کے علاوہ لاہور کے علمار و فضلار بھی اُن سے علمی استفادہ کرنے آتے تھے۔ ۱۲۲۳ء تک مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تجّار اور عوام اپنے کاروبار چھوڑ کر ان کی تذکیر سننے جمع ہو جاتے تھے۔ غالباً اُن کے مجتہدانہ افکار کی بنا پر لاہور کے کچھ لوگ اُن کے خلاف ہو گئے۔ افسوس ہے کہ مترجم نے لوگوں کی مخالفت کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ مخالفین کے مقابلہ میں اُن کو حنفی فقہار نے تحفظ دیا۔ بعد میں وہ حالات سے مجبور ہو کر لاہور سے دہلی چلے آئے جہاں پر دوسرے فضلار کی طرح وہ بھی نظام الملک جنیدی کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے۔

مقدمہ میں دوسرے مصنفین کی طرح یہ بھی دہلی کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے ہوئے اس کو "حضرت دہلی" کہتے ہیں۔ سلطان التمش کی تعریف کرتے ہیں اور اپنے مربّی نظام الملک کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ جنیدی کا مختلف القاب اور خطابات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مثلاً موئید الملک، ملک الوزرار آصف العصر ابوالمعالی محمد بن فخر الملک شرف ابی سعید الجنیدی[۱]۔ سدید الدین محمد عوفی اور دوسرے معاصر مصنفین کی کتابوں میں بھی جنیدی کے لیے یہی خطابات استعمال کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ مسلم ممالک میں منگولوں کی تباہی کے باعث جو مسلمان ہندوستان آئے تھے سلطان اور وزیر اُن کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ خصوصاً وزیر علمار اور فضلار کی بے پناہ اعانت کرتا تھا۔ وزیر گوناگوں مصروفیات کے باوجود کچھ وقت مطالعہ کے لیے نکالتا تھا اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ دینی اور علمی مسائل پر علمار سے گفتگو اور مباحثہ میں بھی وقت صرف کرتا تھا۔ علم سے اس کی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں دولت کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ کثیر رقم کتابوں کے حاصل کرنے پر صرف کرتا تھا اور ہمیشہ دنیاوی عیش وعشرت پر روحانی ترقی کو ترجیح دیتا تھا۔

جہاں تک عربی سے فارسی میں ترجمہ کا معاملہ ہے مترجم نے بڑی کامیابی کے ساتھ عبارت کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا ہے۔ قرآنی آیات، احادیث نبوی اور صحابہ اور دوسرے اکابرین دین سے متعلق روایات کو عربی متن کے ساتھ ساتھ اُن کا فارسی ترجمہ

---

[۱] ترجمہ احیاء علوم الدین، مخطوطہ برٹش لائبریری لندن ورق ۳ الف۔

دیا ہے۔ علاوہ ازیں ہر مشکل مسئلہ کی توجیہ اور تشریح کی بھی کوشش کی ہے۔ تاکہ قارئین کو پورا فائدہ ہو سکے۔ فارسی نثر میں اُن کا اسلوب نگارش بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں صنائع بدائع، تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے پرہیز کیا گیا ہے۔ صرف مقدمہ میں مرصع نثر ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے رسالہ اعجاز خسروی میں مترجم کو ایک اہم اسلوب کا موجد تصور کیا ہے۔ امیر خسرو کے مطابق مجد الدین جرجامجی فارسی نثر کے اولین اہم نثر نگاروں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے ان کا شمار ان چھ نثر نگاروں میں کیا ہے جو کہ اپنے منفرد اسلوب کے لیے مشہور تھے۔ ان نثر نگاروں میں سے دو ایسے تھے جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ پہلے نثر نگار شیخ علی ہجویری ہیں جن کی تالیف کشف المحجوب فارسی نثر میں تصوف اور صوفیا پر پہلی کتاب ہے اور دوسرے ہمارے مترجم جرجامجی ہیں۔ خسرو مزید فرماتے ہیں کہ شیخ علی ہجویری کا آسان اسلوب تصوف اور صوفیاء کے تذکروں کے لیے نہایت موزوں ہونے کی وجہ سے مقبول ہوا جبکہ احیاء علوم الدین کے فارسی ترجمہ کا اسلوب فلسفہ اور عالمانہ مسائل کو بیان کرنے کے لیے بہترین اور باوقار تصور کیا گیا۔[۱]

ترجمہ کے مطالعہ سے ہند میں نووارد مسلم مہاجرین کے مذہبی رجحانات اور روایات کا بھی علم ہوتا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر مسلمان وسط ایشیا اور موجودہ افغانستان کے علاقوں سے سلطنت دہلی میں آئے تھے اور وہ سب فقہ حنفی کے ماننے والے تھے اور مترجم بھی فقہ حنفی کے عالم تھے لہٰذا فقہ حنفی کی تقلید کے سختی سے قائل تھے۔ امام غزالی فقہ شافعی کے ماننے والے تھے انھوں نے اسی کی روشنی میں فقہی مسائل کی توجیہ کی ہے لیکن مترجم نے جہاں بھی احیاء علوم الدین میں شافعی فقہ کے مطابق کسی مسئلہ کی توجیہ پائی ہے اسے بدل دیا ہے اور حنفی نقطۂ نظر سے مسائل کی توجیہ کی ہے۔ مترجم نے اپنے اس عمل کو فخریہ طور پر بیان کیا ہے[۲]۔ اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ اس زمانہ کے سنی مسلمان فقہ شافعی کے خلاف تھے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی سنی مسلمانوں کی اکثریت شروع ہی سے فقہ حنفی

۱۔ امیر خسرو۔ اعجاز خسروی، جلد اول، نول کشور ص ۵۶-۵۷

۲۔ فارسی ترجمہ احیاء علوم الدین، م۔ ورق ۳ الف

کی سختی سے پابند رہی ہے اور دوسرے سنّی مکاتب فکر سے بے اعتنائی برتی گئی ہے اگر کبھی کسی نے اس رویہ کے خلاف آواز بلند کی تو اس کی نیت پر شک کیا گیا۔[1]

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ترجمہ نے کافی قبول عام حاصل کیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے عظیم ہندوستانی مسلم مورخ ضیاء الدین برنی نے اس ترجمہ کو تیرھویں اور چودھویں صدی میں جو ہندوستان میں اسلامی علوم اور تاریخ پر لٹریچر لکھا گیا اس کی معیاری کتابوں میں شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں جو بلند پایہ عربی اور فارسی کتابیں مقبول تھیں اور جن کی مانگ تھی اُن میں احیاء علوم الدین کا فارسی ترجمہ بھی تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ صوفیاء کرام کے حلقہ میں بھی یہ عوارف المعارف کی طرح مقبول تھی اور اُن کتابوں میں سے ایک تھی جن پر شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں تبصرہ ہوتا تھا۔ دوسری کتابیں کشف المحجوب، رسالہ قشیری، قاضی حمید الدین ناگوری کی لوائح اور لوامع اور فوائد الفواد مولفہ حسن سجزی تھیں۔[2]

احیاء علوم الدین کی طرح شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (م ۱۲۳۴ء) کی شہرہ آفاق تصنیف عوارف المعارف کا بھی عربی سے فارسی میں ترجمہ تیرھویں صدی عیسوی ہی میں ہوا۔ اس کے مترجم شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی ملتانی کے فاضل مرید داؤد خطیب تھے۔ وہ ملتان اور سندھ کے حکمراں سلطان تاج الدین ابوبکر (م ۱۲۴۵ء) کے دربار سے بھی منسلک تھے۔ عوارف المعارف کی شہرت اور مقبولیت کے پیش نظر سلطان تاج الدین ابوبکر نے داؤد خطیب کو اس کے ترجمہ کی ترغیب دی۔[3] آخر الذکر نے اس کام کو انجام دینے کے لیے اپنے پیر و مرشد

---

[1] اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ تغلق شاہ کے عہد حکومت میں شیخ نظام الدین اولیاء کی سماع کی محفلوں کو علماء نے قانون شریعت کے خلاف بتایا تو سلطان نے اس کی قانونی حیثیت جاننے کے لیے محضر طلب کیا شیخ نے علماء کے اعتراضات کے جواب میں قدیم روایات کا حوالہ دیا لیکن علماء نے یہ کہتے ہوئے سننے سے انکار کر دیا کہ ان کو سمع کا جواز فقہ حنفی سے دیا جائے اخیر تک یہی رویہ ملتا ہے۔

[2] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ سر سید ایڈیشن، ص ۵۷

[3] سلطان تاج الدین ابوبکر کے باپ ملک کبیر ایاز سلطان رضیہ کے زمانہ میں ملتان اور سندھ کے والی یعنی گورنر تھے جب سلطان معز الدین بہرام (م ۱۲۴۲ء) کے عہد میں منگولوں نے ملتان پر حملہ کیا اور دہلی سے فوجی مدد آنے کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے منگولوں سے کامیابی کے ساتھ جنگ کی۔ اس کی موت پر اس کا بیٹا تاج الدین سلطان بنا باپ کی طرح یہ بھی بڑا بہادر تھا لیکن جلدی انتقال کر گیا۔

سے اجازت چاہی۔ پیر نے بخوشی اجازت دی اور جہاں روحانی مسائل کی توجیہہ میں مترجم کو مشکل پیش آئی اُن کے حل میں ان کی مدد بھی کی۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ تیرھویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں سہروردی اور چشتی صوفیا پر عوارف المعارف کا بے پناہ اثر تھا۔ دونوں سلسلے کے بزرگ اپنے مریدوں کو اس کا درس دیتے تھے اور اس میں مذکور روحانی اقدار اور قدیم بزرگوں سے متعلق روایات کو اپنانے کی تلقین فرماتے تھے۔ ابن العربی کی تصانیف خاص طور پر فصوص الحکم کے ہندوستان میں پہنچنے سے پہلے متشرع صوفیاء کے یہاں اس کتاب کو ایک مقدس کتاب کے طور پر پڑھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے حوالے ملتے ہیں [۱]

مترجم نے سلطان کی فرمائش کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ایک دن اس نے کہا کہ شیخ المشائخ شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف احادیث نبوی اور روایات صحابہ اور روحانی پیشواؤں کا علم بہم پہنچاتی ہے اگر اس کو عربی سے فارسی میں پیش کیا جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ فارسی شیریں ترین زبان ہے۔ اس کے ذریعہ کتاب کے مطالعہ سے بڑی تعداد میں لوگ استفادہ کرسکیں گے اور اُن کی اصلاح ممکن ہوسکے گی۔ کیونکہ اکثریت میں ہندوستانی مسلم اشراف عربی زبان سے نابلد تھے اور فارسی اُن کی اپنی زبان تھی۔ اسی وجہ سے شیخ بہاء الدین زکریا بھی اپنے مرید کے کام سے خوش ہوئے [۲]

کتاب کی اہمیت کے علاوہ ترجمہ کی بھی اپنی بعض امتیازی خصوصیات ہیں۔ کیونکہ قاسم داؤد خود محدث اور فقیہہ تھے لہٰذا ہر مسئلہ کی چاہے وہ شرعی قانون سے متعلق ہو یا روحانی اقدار سے عالمانہ انداز میں تشریح کی ہے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے اپنے اشعار شامل کرکے عبارت کو پُرتاثیر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ کی زبان بھی باوقار ہے۔ مترجم کے اسلوب نگارش کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ قدیم فارسی ادب کی تاریخ میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔

۱؎ ملاحظہ کیجئے حسن سجزی، فوائد الفواد، نول کشور پریس، سنہ ۱۳۰۲ھ صفحہ ۲۶-۲۷

۲؎ فارسی ترجمہ عوارف المعارف، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، سنہ ۳۲ ورق ۱۴ الف تا ۱۵ الف

اختصار کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تیرھویں صدی کے نصف آخر میں عربی کے ان ابتدائی ترجموں نے ایک طرف تو فارسی زبان کو علمی اور اسلامی زبان بننے میں مدد دی تو دوسری طرف ان کے ذریعہ ہندوستان میں اسلامی علوم کا فروغ ہوا۔ تیرھویں صدی کے نصف آخر میں جبکہ عربی کے فضلا، دہلی اور صوبائی شہروں میں بڑی تعداد میں جمع ہوگئے اور وہاں اُن کے مدارس سے مولانا ضیاء الدین سنامی جیسے فقیہ اور محدث نکلنے لگے تب بھی ان ترجموں کی مقبولیت کم نہ ہوئی۔ دنیا کی مختلف لائبریریوں میں ان کے مخطوطات ملتے ہیں اور یہ سب ان کی اُس اہمیت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں لوگ ان کو گراں قدر سرمایہ سمجھ کر ان کی کتابت کرا کے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یقیناً یہ ترجمے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی اور علمی ورثہ کا گراں قدر حصہ ہیں۔ برصغیر ہند میں مسلمانوں کی اسلامی علوم اور فکر و دانش کی تاریخ INTELLECTUAL HISTORY بغیر ان ترجموں کے حوالے کے نامکمل تصور کی جائے گی۔